ڈاکٹر محمد سعید
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
جی سی یونیورسٹی، لاہور

اخلاقیاتِ تحقیق رشید حسن خاں

Rashid Hassan khan is a well known famous name of Urdu research. His research services cannot be summed up in one thesis. He retrieved the missing facts through research, also verified obscure facts and supported known facts; more than that he hold a tight grip on substandard research. They are primary functions of standardization and promotion of Urdu research, which are carried out with great courage and loudness. This article deals with Research ethics and moralities which are linked up with his personal experiences.

اخلاقیاتِ تحقیق کے تقاضوں میں جو سب سے اہم اور بنیادی تقاضا ہے وہ یہ کہ کسی دوسرے کی تحقیق کو آپ اپنے نام سے نہ چھپوائیں ۔ اس جعل سازی کو انتہائی غیر اخلاقی حرکت تصویر کیا جاتا ہے اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں اس کا رگزاری کا عمل جاری و ساری رہتا ہے ۔ رشید حسن خاں ایسی جعل سازیوں اور سہل انگاریوں کے سخت مخالف تھے اور ہمیشہ ایسے جعل سازوں اور سہل انگاروں کے لیے ان کے مضامین تازیانہ بنے رہے ۔ رشید حسن خاں نے تحقیق و تدوین کے معیاری عملی نمونوں کے ساتھ ساتھ اصول تحقیق و تدوین بھی وضع اور مرتب کیے ہیں ۔ ان کے اس سلسلے کے بیشتر مضامین کتابی اور اکتسابی سے زیادہ مشاہداتی ہیں ۔ وہ شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۵۹ء میں وابستہ ہوئے ۔ سندی تعلیم کی کمی کے باعث انھیں بطور ریسرچ اسسٹنٹ لیا گیا ۔ لہٰذا ساری مدت ملازمت معاون تحقیق ہی رہے ۔ ان کے اس منصبی فریضے سے ناجائز فائدہ یوں اٹھایا جاتا تھا کہ تحقیقی کام اُن سے کروائے جاتے وہ دوسروں کے نام سے چھپتے تھے ۔ خصوصاً صدرِ شعبۂ اُردو ڈاکٹر احمد فاروقی کے نام سے ۔ بعض سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے افراتفری میں ، رشید حسن خاں سے کروائی جانے والی ایسی کم معیاری تحقیق موضوع طنز بنتی تو بھی مجرم رشید حسن خاں کو ٹھہرایا جاتا ۔ اور ان سے جواب طلبیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ۔ مثلاً تذکرۂ سرور رشید حسن خاں سے جلد بازی میں مرتب کروایا گیا اور خواجہ احمد فاروقی کے نام سے شائع ہوا ۔ رشید حسن خاں ڈاکٹر مختار الدین احمد کے نام اپنے ایک خط میں ۲۸ ۔ ستمبر ۱۹۹۳ء کو لکھتے ہیں :

> ''تذکرۂ سرور کے سلسلے میں کئی صفحوں پر مشتمل ایک یاداشت میں نے دی تھی ۔۔۔۔ اس میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اس کی طباعت شعبے کے لیے باعثِ بدنامی ورسوائی ہوگی ، مگر وہاں بھی وہی بات تھی کہ تاریخ مقرر ہو چکی تھی اور اُس وقت تک کسی بھی صورت میں کتاب چھپنا ضروری تھا ۔ فاروقی صاحب کو معیار سے کبھی کوئی دل چسپی نہیں رہی ، اُن کی دل چسپیوں کے مراکز دوسرے ہوتے تھے'' ۔ [۱]

اُصول تحقیق سے متعلق رشید حسن خاں کی کتاب ادبی تحقیق : مسائل اور تجزیہ کا ایک سلسلہ مضامین ''تحقیق سے متعلق بعض مسائل'' ایسے ہی تنازعات کی ذاتی وارداتوں کے نتائج ہیں ۔ اس سلسلے کا ان کا ایک مضمون ''علمی منصوبے اور اخلاقیات تحقیق'' کے پس منظر میں بھی رشید حسن خاں کے ذاتی مشاہدات و واردات دکھائی دیتے ہیں ۔ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں دہلی یونیورسٹی میں ان کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے تھے کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے بھی ان سے جواب طلبی کر لی ۔ اسی مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف شعبے کے ارباب حل وعقد نے ان کا قافیہ تنگ کر دیا تھا بلکہ انھوں نے یونیورسٹی انتظامیہ کو بھی ان کے خلاف متحرک کیا تھا۔ رشید حسن خاں کا مذکورہ مضمون ابتدایہ سطح پر یورنیورسٹی انتظامیہ کو دیا گیا جواب ہے جو نظر ثانی کے بعد ایک مضمون کے طور پر شائع ہوا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کو دیے گئے ایسے جوابات کا ابھی تک چونکہ کوئی دفتری ریکارڈ سامنے نہیں آیا البتہ اس مضمون کی مدد سے کچھ حقائق تک پہنچنے میں ضرور مدد ملتی ہے ۔لیکن اس سے پہلے اس زمانے میں رشید حسن خاں جیسے مضبوط اعصاب انسان کی شخصیت کی شکست و ریخت اور عالم بے کیفی کو ملاحظہ کیا جائے جو ۱۹۶۹ء میں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی ۔ وہ ۲۶ ۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو رئیس احمد نعمانی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''آج کل ایک عجیب عالم بے کیفی طاری ہے ، دنوں سے سبھی سے رسم پیام وسلام بند ہے اور ویسے بھی قلم کو گویا زنگ سا لگ گیا ہے ، طبیعت بھی کچھ بجھ سی گئی ہے..... سیاسی حالات نے اور دیوانہ بنا رکھا ہے ، زمین سخت ہے آسمان دور ہے۔ ہر طرف انداز کوفی و شامی نظر آتے ہیں اور شرارِ بولہبی کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے ۔ حد یہ ہے کہ ذہن نے گھبرا کر خواب دیکھنا بھلا دیا ہے اس سے زیادہ اذیت ناک صورت حال کیا ہو گی کہ یہی ایک سہارا ہوتا ہے کچھ دیر کے لیے دم لینے کا..... جتنے خواب کبھی دیکھے گئے تھے، آج ان سب کی تعبیروں کی شکستہ صورتیں ہر طرف حلقہ زن ہیں اور ایک ایسے رقص میں مصروف ہیں ، جس کے ختم ہونے کے آثار بظاہر نظر نہیں آتے''۔ [۲]

اس خط میں '' اندازِ کوفی و شامی'' اور ''شرارِ بولہبی'' سے بہ طور خاص شعبے کے حالات کی طرف اشارہ مراد لیا جا سکتا ہے ۔ رئیس احمد نعمانی کے نام اس خط کے ساتھ سلمان احمد رباب رشیدی کے نام ایک خط کو بھی پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے ۔ ان دونوں خطوں میں اس زمانے کے بعض مسائل کو بڑے علامتی انداز میں بیان کیا ہے ۔ رباب رشیدی کے نام کا خط بہت طویل ہے اور اس کا بھی ایک ایک جملہ اہم ہے اس خط پر تاریخ درج نہیں لیکن رئیس احمد نعمانی کے نام مندرجہ بالا خط اور اس کا موضوع بلکہ لفظوں اور جملوں تک میں بڑی مطابقت ہے ۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک ہی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے اور تقریباً ایک ہی وقت میں لکھے گئے ہیں ۔

سلمان احمد رباب رشیدی کے نام رشید حسن خاں کے طویل خط کا پہلا حِصّہ ملاحظہ کیجیے جو تقریباً اکتوبر ۱۹۶۹ء کے اواخر میں لکھا گیا۔ اس کا آغاز ہی یہاں سے ہوتا ہے :

''برادرِ عزیز! دنوں سے بہت سے احباب کو مجھ سے دو شکایتیں ہیں: ایک تو یہ کہ میرے لہجے میں 'وہ قلم کا ہو یا زبان کا' تلوار کی دھار ہے، وہ لوچ نہیں جو منافق آدمی کی بات میں ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ مجھے منفعل ہونا نہیں آتا۔ مجھے ہمیشہ اس کا اعتراف رہا کہ میرے لہجے میں واقعی وہ تہہ داری اور غدوبت نہیں، جس سے گفتگو یا تحریر میں، ایسا دور خا پن پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر شخص بقدرِ ذوق وظرف اس کی مناسب تاویل کر سکے، دوسرے لفظوں میں مجھے اس کا اقرار ہے کہ میری گفتگو یا تحریر، سرور صاحب کی تنقید نہیں بن سکی، جس سے آخر تک ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے والی کاری گری کارفرما ہو اور اس پر مجھے اس سے پہلے بھی معذرت طلب ہونے کی ضرورت نہیں پیش آئی، نہ اب ضرورت محسوس ہوتی ہے''۔ [۳]

اس اقتباس سے جہاں رشید حسن خاں کی شخصیت کے ایک مرکزی پہلو حق گوئی کی وضاحت ہوتی ہے وہاں ان کے ادبی معتقدات کے حوالے سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ وہ اپنی تحریر و تقریر میں صاف گوئی پر بڑی مستقل مزاجی سے قائم ہیں اور کوئی خوف یا لالچ انھیں معذرت طلبی پر آمادہ نہیں کر سکا۔ یہ کون سی صاف گوئی ہو سکتی ہے جس کا اظہار اُن کے قلم سے بھی ہو رہا ہے اور گفتگو سے بھی۔ مجموعی طور پر تو اس کا اطلاق اُن کی اُس وقت تک کی ہر طرح کی تحریر و تقریر پر بھی ہوتا ہے لیکن یہاں اس اقتباس میں بہ طور خاص شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں در پیش مسائل موضوعِ سخن ہیں۔ رشید حسن خاں یقیناً اپنے رفقائے کار کو خصوصاً اور باقی اہلِ علم کو عموماً اپنی بے لاگ گفتگو کا موضوع مختلف محفلوں میں بناتے رہتے تھے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی، خلیق انجم اور خصوصاً عبداللہ ولی بخش قادری کے رشید حسن کے بارے میں مضامین سے اندازہ ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں لوگوں کو اپنے سخت لہجے سے ہدف بنائے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ردِّعمل میں کچھ نہ کچھ تو آنا ہی ہوتا ہے۔ کہیں سے تیر، کہیں سے پتھر، کہیں سے اَن پڑھ ہونے کا طعنہ اور کہیں سے ریسرچ اسسٹنٹ ہونے کا۔ خاں صاحب عموماً ان کو برداشت کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کے اہداف بھی ان کے لہجے کے عادی ہو چکے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خاں صاحب کا دوست دشمن کوئی بھی انھیں بھلا نہیں سکتا تھا کیونکہ اُن کی باتیں دلوں میں اُتر جاتی تھیں مخالفین کے تو ذہن میں گھر بھی کر لیتی ہوں گی۔ یہ فطری بات تھی۔ شعبے میں تمام وضع داریوں اور ملنساریوں کے باوجود لوگ انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ حساب چکانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوتا تھا۔ پھر یہ ہے کہ کسی شعبے کی فضا اور ماحول زیادہ تر اُس شعبے کے چیئرمین کے ماتحت اور زیرِ اثر ہوتا ہے۔ صدرِ شعبۂ اُردو خواجہ احمد فاروقی بھی یقیناً اپنے نام سے چھپنے والے غیر معیاری کاموں کی وجہ سے اعتراضات کی زد میں رہتے تھے۔ اس صورت میں رشید حسن خاں پر انھیں دہرا غصہ رہتا ہوگا کہ واقف حال جانتے ہیں کام رشید حسن خاں کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ رشید حسن خاں اپنی محفلوں میں انھیں ہدف بناتے تھے۔ لگتا ہے اُس زمانے میں خاں صاحب کہ یہ لَے خاصی تیز ہو گئی ہو گی۔ جس وجہ سے اُن کے خلاف انتظامیہ کو کارروائی کے لیے اکسایا گیا ہوگا۔ کیونکہ یہ ان معنوں میں آسان تھا کہ رشید حسن خاں جو کام کرتے ہیں وہ صدرِ شعبۂ کے نام سے چھپ جاتا ہے لہٰذا یونیورسٹی انتظامیہ کو جواب دہی کے لیے اُن کے پاس کیا ہے جس کی وہ تنخواہ

لے رہے ہیں ۔ منافقتیں اور ذہن و دل کو لگنے والی چوٹیں انتہا کو نہ پہنچ چکی ہوتیں تو ان سے یہ سوال بنتا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ تنخواہ کے بدلے میں کام تو کر رہے ہیں ۔ وہ تحقیقی کام اُن کے نام سے چھپ جاتا تب بھی سوال کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور اگر ان کے نام سے نہیں چھپتا اور محض اُن کی معاونت کا شکریہ ادا کر دیا جاتا ہے سوال تب بھی نہیں بنتا لیکن معاونت میں چونکہ یہ گنجائش ہے کہ اس کا تعین نہیں ہوسکتا کہ کتنی معاونت کی ہے اس طرح آسانی سے ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ بس معمولی معاونت کی ہے ۔ پھر اس کے ساتھ ان کے انفرادی کاموں کو بھی پیش کیا گیا ہوگا کہ یہ تنخواہ تو یونیورسٹی سے لیتے ہیں اور کام دوسرے اداروں کا کرتے ہیں اور ان سے الگ پیسے وصول کرتے ہیں ۔

رشید حسن خاں کے لیے ۱۹۶۷ء اور اس کے بعد کچھ ایسی صورتِ حال ضرور پیدا کر دی گئی تھی کہ یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے اُن کی پیشیوں اور جواب طلبیوں کا سلسلہ شروع ہوا ہوگا۔ انھوں نے جواب بھی ضرور دیے ہوں گے اور مفصّل ۔ رشید حسن خاں کے ایسے سب جواب شاید محفوظ نہ رہے ہوں لیکن دو ایک ضرور محفوظ رہ گئے چونکہ وہ ترمیم و اضافہ کے بعد مضامین کی صورت میں شائع ہو گئے ۔ ۱۹۶۸ء میں کراچی کے ماہنامہ نگار میں ان کے مضامین کا ایک سلسلہ ''تحقیق سے متعلق بعض مسائل'' کے عنوان سے چھپا ۔ اس کی پہلی قسط اپریل ۱۹۶۸ء میں، دوسری مئی، تیسری اکتوبر اور چوتھی نومبر ۱۹۶۸ء اور پانچویں مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی ۔ مزید ترمیم و اضافہ کے بعد یہ سلسلہ مضامین اسی عنوان سے اُن کی کتاب ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ میں شامل ہوا اور اس کے ذیلی عنوانات بھی بنا دیے گئے ۔اس کتاب میں اس سلسلے کا تیسرا ذیلی عنوان ''تحقیق اور بُل ہوسی'' اور چوتھا ''علمی منصوبے اور اخلاقیاتِ تحقیق'' یونیورسٹی کی اُسی فضا اور جواب طلبیوں کے جوابات میں لکھے گئے ہیں ۔ ان میں سے بھی ''علمی منصوبے اور اخلاقیات تحقیق'' کا تو ایک ایک جملہ گواہی دیتا ہے کہ یہ سب سے پہلے یونیورسٹی انتظامیہ کی جواب طلبیوں کے جواب میں پیش کی گئی تحریر ہے جو ترمیم کے بعد نگار (کراچی) کے مئی ۱۹۶۹ء کے شمارے میں مضمون کے طور پر شائع ہوئی۔ رشید حسن خاں نے اسے اپنی کتاب میں شامل کرتے ہوئے مزید نظرِ ثانی کی جس کے تحت کچھ مباحث کو نکال دیا اور کچھ باتوں کا اضافہ بھی کیا۔ اس طرح یہ تحریر دو تین بار نظرِ ثانی کے عمل سے گزرنے کے بعد انتظامیہ کو دیے گئے جواب کے دائر سے نکل کر خالص علمی مضمون بن گیا ہے۔ یہاں چونکہ شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں رشید حسن خاں کو درپیش بعض مسائل کے پس منظر میں اس مضمون کا مطالعہ کرنا مقصود ہے اس لیے نگار (کراچی) میں اس کی پہلی اشاعت کو پیشِ نظر رکھا جائے گا تاکہ ان کے تلخ لہجے کو بھی سامنے لایا جا سکے جس سے یونیورسٹی انتظامیہ تو یقیناً مطمئن ہوگئی ہوگی لیکن صدرِ شعبۂ اُردو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور اُن کے بعض احباب ضرور ناراض ہو گئے ۔

شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں رشید حسن خاں سے جو کام لیے جاتے تھے اُن میں ایک تو یہ تھا کہ بعض قدیم مخطوطات کو انھوں نے مرتب کرنا تھا ۔ دوسرا کام اُن کے ذمے یہ تھا کہ شعبۂ اُردو کے تحقیقی مجلّے اردوے معلی کو مرتّب کرنا ۔ اِن کاموں کو کرنے کی عملی طور پر دو صورتیں روا رکھی جاتی تھیں ۔ پہلی صورت یہ تھی کہ رشید حسن خاں کوئی متن مرتب کر

دیں اور خواجہ احمد فاروقی کے نام سے چھپ جائے ۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ رشید حسن خاں کے ساتھ شعبے کے کسی استاد کو مقرر کر دیا کہ دونوں مل کر کام کریں ۔ ہر دو صورتوں میں ہوتا یہی تھا کہ کام رشید حسن خاں کریں لیکن ظاہر یہ کیا جائے کہ وہ صرف ان اسکالرز کے اسسٹنٹ ہیں۔ رشید حسن خاں نے اپنے مضمون ''علمی منصوبے اور اخلاقیاتِ تحقیق'' میں جہاں یونیورسٹی انتظامیہ کے بعض سوالات کے جوابات دیے ہوں گے وہاں ان کو شعبۂ اُردو کے رفقا سے جو رکاوٹیں اور جو مسائل درپیش ہوں گے اُن کو بھی بیان کیا ہوگا۔ اس مضمون کا مرکز و محور زیادہ تر خواجہ احمد فاروقی رہے ہیں لیکن کہیں کہیں دیگر احباب کی طرف بھی اشارے ہیں ۔ اب ذیل میں اس مضمون کا اس پس منظر میں مطالعہ پیش کیا جاتا ہے ۔

اُردو سے وابستہ بیشتر لوگوں میں عموماً تن آسانی ، کاہلی، غیر ذمہ داری کا رویہ پایا جاتا ہے ۔ اس لیے اُردو میں گروپ ریسرچ کو زیادہ فروغ نہیں مل سکا۔ کیونکہ اگر کوئی ایسا علمی منصوبہ تیار ہو تو اُس سے وابستہ افراد میں سے تنہا کوئی شخص جوابدہ نہیں ہوتا اس لیے یہ آسانی رہتی ہے کہ اعتراضات کی صورت میں بات ایک دوسرے پر ڈالتے رہتے ہیں ۔ دہلی یونیورسٹی شعبۂ اُردو کے تحت بھی کچھ علمی منصوبوں میں رشید حسن خاں کو شعبے کے کسی استاد کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں جیسے'' دیوانِ میر سوز'' کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور رشید حسن خاں دونوں شامل تھے ۔ رشید حسن خاں چونکہ ریسرچ اسسٹنٹ کی صورت میں موجود ہیں لہٰذا کام کرنا اُن کی ذمہ داری ہے۔ دوسرے اسکالرز کو اس طرح تن آسانی کا موقع مل جاتا تھا لیکن نام چھپوانے کے وقت وہ لوگ برابر کے حِصّہ دار بن جاتے تھے ۔ رشید حسن خاں کا موقف اپنے بارے میں یہ تھا کہ اگر انھیں انفرادی طور پر کسی کام میں لگایا جائے تو وہ زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دے سکتے ہیں ۔ وہ اپنے مذکورہ مضمون میں لکھتے ہیں :

> ''ہمارے یہاں شروع سے انفرادی کاموں کی طرف توجہ مبذول رہی ہے ۔ کام کرنے والوں نے الگ الگ کام کرنا زیادہ پسند کیا (اگر یہ اجتماعی کام کرتے ہیں تو) اس سلسلے میں بعض ضابطوں کا تعین کر لیا جائے ۔ ان ضابطوں کا حقیقی تعلق اخلاقیات سے ہوگا..... لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تحقیقی کام کرنے والے جن کے متعلق یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ایماندار ہوں ۔ وہی لوگ سب سے زیادہ بے پرواخرام ،اخلاقیات سے بے نیاز اور غیر ایماندار نظر آتے ہیں''۔ [۴]

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی چونکہ شعبے کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے ذریعے یا ان کے نام پر متعدد سیاسی شخصیات سے شعبے اور یونیورسٹی کے لیے کسی نہ کسی طرح مدد لینے کی کوشش میں رہتے تھے۔ اس لیے اُن کے اس طریقِ کار کو لوگ دو طرح سے دیکھتے تھے۔ کچھ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ شعبے کی تعمیر و ترقی کے لیے کرتے ہیں اور کچھ کا خیال تھا کہ وہ اپنے نام و نمود کے لیے کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں اس دوسرے خیال کے حامی تھے اور کہتے تھے کہ وہ اپنی شہرت کی غرض سے تحقیقی معیارات کو قربان کرتے ہیں ۔ ملاحظہ کیجیے ان کے مضمون سے ایک اقتباس:

> '' ادبی و تحقیقی کاموں کے جو منصوبے تیار کیے جائیں وہ سراسر علمی مقاصد کے حصول کے لیے ہوں ،

دوسرے اغراض و مقاصد کے حصول کی لاگ نہ ہو۔ تحقیق کے صحیفۂ اخلاقیات کا یہ سب سے پہلا اور سب سے اہم ضابطہ ہونا چاہیے اور اس وقت سب سے زیادہ خلاف ورزی اسی ضابطے کی ہو رہی ہے۔ انفرادی طور سے جو کام کیے جا رہے ہیں (مستثنیات سے قطع نظر) اور اجتماعی طور سے جن کاموں کے خاکے بنائے جاتے ہیں، ان سب میں حقیقی مقصد ہوتا ہے، ذاتی نام ونمود، حلقۂ اثر اور حلقۂ اقتدار کی توسیع کے امکانات کی تلاش۔ تحقیقی کام کرنے والوں کی فہرست میں اپنا نام بھی لکھائے رکھنے کی تمنا اور اسی طرح کی اور بوالہوسانہ خواہشات کی تکمیل۔ اور ان سب کا مآل یہ ہوتا ہے کہ کاموں کا انداز علمی نہیں رہتا۔ علمی حیثیت ثانوی بلکہ اس سے بھی فروتر ہو جاتی ہے اور اصل حیثیت اس کی ہوتی ہے کہ وہ کام، ان مقاصد کے حصول میں کس حد تک معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ اسی حصولِ معاونت کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر، ان کاموں کی تکمیل کی جاتی ہے۔ ایسے کام ذاتی مفاد کے حصول کا تو بہت اچھا ذریعہ بن سکتے ہیں لیکن تحقیق کی عزت و آبرو خاک میں مل جاتی ہے''۔ [۵]

رشید حسن خاں باصلاحیت آدمی تھے اور اس کے ساتھ وہ اپنی اس صلاحیت کو استعمال کرنے میں آسان پسندی کے قائل نہیں تھے۔ تحقیقی معیارات کو برقرار رکھنے کے لیے سخت محنت اور نیک نیتی سے کام کرتے تھے۔ جبکہ شعبے میں بعض ضروری مقاصد کے لیے انھیں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ معیاری کام بے شک نہ کریں لیکن مقررہ تاریخ تک ہر صورت کر دیں کام جیسا بھی ہو۔ ذیل کا اقتباس تذکرۂ سرور کی ترتیب و اشاعت کے پس منظر کو واضح کرتا دکھائی دیتا ہے۔

دوسرا تباہ کن پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی منصوبہ خالص علمی و تحقیقی بنیادوں پر مبنی نہ ہو، اس صورت میں اس منصوبے میں کام کرنے والے افراد کتنے ہی باصلاحیت اور ایماندار ہوں، لیکن اُس منصوبے کے تحت جو کام کیا جائے گا، وہ کبھی معیاری کام نہیں ہو سکے گا۔ منتہائے نظر اگر علمی نہ ہو تو ساری صلاحیت اور ایمانداری بے کارِ محض ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح ہوتا یہ ہے کہ کام ہی تباہ نہیں ہوتا اور معیار ہی مستقل طور سے مجروح نہیں ہو جاتا، بلکہ ایسے منصوبوں میں اگر کچھ ایماندار کام کرنے والے ہیں تو کچھ دنوں کے بعد ان کے اندر کام کرنے کی امنگ اور تحقیقی ایمانداری کا بے حد سخت تصور اور معیار پرستی کا جذبہ دم توڑنے لگتا ہے، اور آخر آخر تھک ہار کر وہ اپنے آپ کو اسی طائفے کا ایک فرد تصور کرنے لگتے ہیں۔ زندہ تو رہنا ہے ان کو بھی اور ان کے متعلقین کو بھی، اور یہ صورتِ حال بالکل ویسی ہے، جیسے اسمگلروں اور گرہ کٹوں کے یہاں واقع ہوتی ہے۔ جہاں نوگرفتاروں کو اس طرح سدھایا جاتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کے اندر پچھلی ایمانداری کا دوامی تصور باقی نہ رہے۔ اور جس چیز کو ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے، ان کے کان اُس کو سننے سے انکار کرنا سیکھ لیں، یہاں تک ضمیر کی آواز ہی ہمیشہ کے لیے ڈوب کر رہ جاتی ہے''۔ [۶]

تذکرۂ سرور ، گنج خوبی ، دیوانِ بقا اور بعض دوسرے مخطوطات کی تدوین چونکہ رشید حسن خاں نے کی اور وہ خواجہ احمد فاروقی کے نام سے چھپے تھے۔ اس صورتِ حال کو بڑے واضح انداز سے رشید حسن خاں نہ صرف بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے نتائج اور اثرات بھی بتاتے ہیں کہ انھیں قلم کا مزدور سمجھا جاتا ہے جس سے فطری طور پر وہ سچی لگن سے کام نہیں کر سکتے ۔ ملاحظہ کیجیے ان کے مضمون کا متعلقہ اقتباس:

'' دوسری ضروری بات یہ ہے اور اس کا حقیقی تعلق اخلاقیاتِ تحقیق سے ہے کہ کسی منصوبے میں جتنے لوگ کام کر رہے ہوں ، ان سب کو برابر کا شریک سمجھا جائے ۔ ایسا نہ ہو کہ کام تو کریں دوسرے لوگ، اور جب وہ شائع ہو تو ایک دوسرے صاحب کے نامۂ اعمال میں اس کا اندراج ہو۔ یہاں یہ طریقہ وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے کہ کام تو کرتے ہیں دوسرے اور وہ سامنے آتا ہے کسی اور کی کاوش کا روپ دھار کر اور اس طرح اس سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ، مالی یا دوسری نوعیت کے، وہ سب ایک ایسے صاحب کو حاصل ہوتے ہیں جن کا اپنا حصہ اس کام میں کم سے کم ہے یا بالکل نہیں ہے ۔ اس طریقۂ غارت گری نے بہت خرابیاں پھیلائی ہیں ۔ بات صاف ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ کام کرنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ کام کسی دوسرے کے نام سے شرف انتساب پائے گا ۔ وہ اس کام کو سچی لگن کے ساتھ کبھی نہیں کر سکتے ۔ ادبی تحقیق مزدوری نہیں ہوتی ، جس کو شام تک کرنا ہی ہے اور پھر معاوضہ لے کر ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو جانا ہے۔ اس میں آنکھوں کا تیل ٹپکانا پڑتا ہے اور دل خون کرنا پڑتا ہے۔ کسی فن کار کو اپنی اچھی تخلیق جس قدر عزیز ہو سکتی ہے ۔ اسی قدر یہ کام بھی عزیز ہوتا ہے ایسے کام کرنے والوں کو ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ جانتے بوجھتے کہ یہ ساری کاوش ، اُن کے نام کے انتساب سے قطعاً محروم رہے گی ، وہ اس کام کو دلچسپی کے ساتھ کریں گے۔ جس دل چسپی سے ایسے کام کیے جاتے ہیں یا کیے جانا چاہیے''۔ [۷]

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے کام کرنے اور کروانے کے طریقِ کار کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں :

''خواجہ صاحب شعبے کے جن لوگوں سے جم کر کام لیتے تھے ، وہ جب تک کسی کام کے سلسلے میں شعبے میں رہتے ، خواجہ صاحب چائے منگاتے رہتے اور ایسا اکثر ہوتا کہ کام ختم کر کے ٹیکسیاں منگواتے ۔ سب کو لے کر کشمیری گیٹ پر خیبر ریستوران یا جامع مسجد پر کریم ریستوران لے جاتے ۔ ایک ایک سے پوچھ کر اس کی پسند کے کھانے کا آڈر دیتے اور اس کا بل وہ اپنی جیب سے ادا کرتے''۔ [۸]

اس طریقِ کار میں یہ دونوں صورتیں موجود ہیں کہ احباب اور رفقاے کار سے جو کام لیا جاتا ہے وہ شعبے اور یونیورسٹی کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور اپنا ذاتی کام بھی ہو سکتا ہے ۔ شعبے میں بعض تحقیقی منصوبوں کی ترتیب و تکمیل کے لیے بھی یہ طریقہ اپنایا جاتا ہوگا۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں :

'' ایک اور مشکل کا ذکر بھی ضروری ہے، کچھ وقت کی کمی کی وجہ سے کچھ سہل انگاری کی وجہ سے اور زیادہ تر

اس وجہ سے کہ ایمانداری کا تصور دھندلا کر رہ گیا ہے ، یہ معروف اور صاحب منصب حضرات ایک اور طریقۂ کار بھی اپناتے ہیں اور وہ یہ کہ اصل کام بعض شاگردوں یا ایسے دوسرے متعلقین کے حوالے کر دیا جاتا ہے ۔ وہ لوگ اپنی اپنی رسائی کے بقدر اس کام کو بھرتے بھگتے ہیں اور وہ سارے اجزائے پریشان استادِ محترم یا آقائے نامدار کے حوالے کر دیے جاتے ، جو کچھ فقرے بدل کر اور کچھ عبارتوں کا اضافہ کر کے ، ان کی شیرازہ بندی کر دیتے ہیں ۔ بہر حال پھٹکری کے بغیر رنگ چوکھا ہو گیا۔ فرمائش کی تعمیل بھی ہو گئی اور تحقیق کا حق بھی ادا ہو گیا اور مقالہ نگار بزرگ لہو لگا کے شہیدوں میں مل گئے''۔ [۹]

خواجہ احمد فاروقی خوبصورت نثر لکھنے والوں میں شمارہ ہوتے ہیں ۔ انشائیہ نما اسلوب ان کی ہر طرح کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ظاہر ہے یہ اسلوب تحقیق کو راس نہیں آتا ۔ ذیل کے اقتباس میں رشید حسن خاں کا روئے سخن خواجہ احمد فاروقی کی تحقیقی کاوشوں کی طرف ہے جس میں وہ اُن کے اسلوب اور اُن کے علم دونوں کو ہدف بنا رہے ہیں :

''اگر تحقیق کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے اور الفاظ کو اُن کے بالکل صحیح معانی میں استعمال کرنے کے سلسلے میں تحقیق نے جو بندشیں عائد کر رکھی ہیں ۔ اُن کی پوری پوری پابندی کی جائے تو پھر خیال آرائی ، انشائیہ نما اسلوب بیان ، غیر ذمہ دارانہ تصنیفات اور مرصع انداز نگارش کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی ۔ اور یہ کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے ، کیونکہ متعدد ناقدین کا سرمایۂ کمال یہی ہے ۔ سارا جادو اسی کا بخشا ہوا ہے ، اگر یہ مرصع اندازِ تحریر اُن سے چھین لیا جائے ، یا اس پر پابندی لگا دی جائے ، یا اس کو تنقید کے منافی قرار دے دیا جائے تو ان غریبوں کے پاس بچے گا کیا۔ سادہ بے رنگ لفظوں سے عبارت کو آراستہ کرنا بہت مشکل کام ہے ۔ کیونکہ اس صورت میں خیالات ،معلومات ،فکر آگہی اور زبردست فنی صلاحیت کی مدد سے عبارت میں تاثیر پیدا کرنا پڑے گی اور رنگین لفظوں کا جلوس ترتیب دینے کی بجائے مکمل عبارت پر توجہ کرنا پڑے گی ، دوسرے لفظوں میں نظر جما کر پڑھنا پڑے گا۔ دل لگا کر سوچنا ہو گا اور غیر جانبدار ہو کر سادگی کے ساتھ اس کا اظہار کرنا پڑے گا۔ ہوا میں گرہ لگانا اور متعین مفاہیم سے عاری الفاظ سے کھیلنا نصیب نہیں ہو سکے گا اور آسان پسندی اور مصلحت پرستی کبھی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ناقد کو ایک شاعر کے متعلق صحیح طور سے ایسے واقعات کا علم نہیں جو اس کی زندگی میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں ، ایسی اہمیت جو اس کے کلام پر پوری طرح اثر انداز ہو، وہ اس کے کلام کے صحیح متن سے بھی واقف نہیں ، اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ بعض باتوں کو ثابت کرنے یا بعض امور کو متعین کرنے کے لیے جن اشعار کو وہ پیش کر رہا ہے ، وہ اسی شاعر کے ہیں یا دوسروں سے ان کا انتساب کیا جا چکا ہے اور غضب یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کو معلوم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی ''۔ [۱۰]

اس اقتباس کے آخری حصّے کا روئے سخن خاص طور پر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب میر : حیات اور شاعری کی

طرف ہے کہ اُس میں ایسے مسامحات موجود ہیں ۔

اس مضمون کے آخری حصّے سے ایک اقتباس اور ملاحظہ کیجیے جس میں خواجہ احمد فاروقی اور اُن کے احباب کو موضوع بنایا جا رہا ہے :

'' جو لوگ ادب و تحقیق کے سر براہ بنے ہوئے ہیں ، اور جن کو '' اساطینِ ادب '' کہا جاتا ہے اور جو ایک طرف تو مستقبل کے محققین کی تربیت کے ذمہ دار ہیں اور دوسری طرف آج کا ادبی کاروبار ان کے ہاتھوں میں ہے۔۔۔۔انھوں نے مختلف مصالح کی بنا پر ایمانداری سے ناتا توڑ لیا ہے ۔ اور ان کی حیثیت اس وکیل کی سی ہو گئی ہے جو عدالت میں جانے کے لیے جب تیار ہوتا ہے تو ایمانداری اور ضمیر کو گاڈریج کی الماری میں بہ حفاظت بند کر جاتا ہے۔ یہ لکھنے پڑھنے سے زیادہ دوسرے کام انجام دیا کرتے ہیں اور اپنے متعلقین کو بھی بالواسطہ یہی سکھاتے ہیں ، یہ ادبی کام کو ادب کی خاطر نہیں کرتے ، دوسرے مصالح کی تکمیل میں معاون وسیلے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں ۔ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور ان کی آنکھوں سے ایمانداری کا نور مفقود ہو چکا ہے۔ خَتَمَ اللہ علیٰ قُلُوبھِم وَعَلیٰ سَمِعھم و علیٰ البصَارِھِم غشَاوۃ ''۔[11]

اس مضمون سے مندرجہ بالا جتنے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے بیشتر یا ان کے بعض حصّے بعد میں رشید حسن خاں نے حذف کر دیے اور ترمیم و اضافہ شدہ اور نظر ثانی شدہ یہ مضمون اُن کی کتاب '' ادبی تحقیق : مسائل اور تجزیہ '' میں شامل ہوا۔اب کتاب میں موجود مضمون کا مطالعہ کریں تو اسی طرح کے کچھ اقتباسات کا اُس میں اضافہ بھی ملتا ہے جو براہِ راست اربابِ شعبۂ سے متعلق ہیں ۔ کتاب میں شامل اخلاقیاتِ تحقیق کے موضوع پر ان کے اس مضمون کے چند اقتباسات میں سے کچھ ٹکرے دیکھیے :

'' یہ روایت سی بن گئی ہے اور علمی اداروں میں بھی اس کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں کہ شخصی وفاداری پر اصرار کیا جاتا ہے اور بہت سی صورتوں میں اس کو معیارِ صلاحیت بھی مان لیا جاتا ہے ۔۔۔۔ایک شخص اگر اپنے فرایضِ منصبی کی حد تک وفادار بھی ہے اور با صلاحیت بھی تو عموماً اُس کو کافی نہیں سمجھا جاتا، اس بات کو ضروری سمجھا جاتا ہے کہ رفیقِ کار بننے کے بعد ، وقار کا احساس اُس کے اندر یا تو بالکل نہ رہے یا نہ ہونے کے برابر رہے۔۔۔۔

اگر کسی شخص نے محنت کے ساتھ علم حاصل کیا ہے ،وہ اپنے موضوع پر دسترس بھی رکھتا ہے اور فرایض منصبی سے وفاداری کو ضروری سمجھتا ہے یہ تو طے شدہ ہے کہ اُس کے یہاں خودداری کا احساس ضرور ہو گا۔۔۔۔ ایسا شخص، شخصی وفاداری کو گھٹیا لوگوں کا کاروبار سمجھے گا۔۔۔۔

۔۔۔۔اس کی توقع کی جاتی ہے کہ نو گرفتار ، وہ استاد ہو، ریسرچ کا طالب علم ہو، وظیفے کا خواست گار ہو یا کسی منصوبے میں کام کرنے والا '' رفیق کار '' ہو: ہر شخص پہلے شخصی وفاداری پر ایمان لائے ، ہر طرح کے

احکام کی بجاآوری میں مہارت پیدا کرے، اور جب وہ منزل آ جائے کہ احساسِ اَنا اور احساسِ وقار کا جو ضروری درجہ حرارت ہوتا ہے، وہ کم ہو جائے ،تب اُس کو کام کا آدمی سمجھا جائے''۔ [۱۲]

رشید حسن خاں کی عبارت کے ان ٹکڑوں کا بھی ایک ایک جملہ اُن کی ذاتی مشکلات کو بیان کر رہا ہے ۔ چونکہ شعبے میں ان سے شخصی وفاداری کا اصرار کیا جاتا تھا، اس لیے وہ اس کی وضاحت کر رہے ہیں کہ منصبی وفاداری کے یہ خلاف ہے۔ اس آخری ٹکڑے کے اس جملے'' کسی منصوبے میں کام کرنے والا'' رفیقِ کار'' میں'' رفیقِ کار'' کو انھوں نے باقاعدہ واوین میں رکھا ہے ۔ ظاہر ہے یہ بھی وہ اپنی بات کر رہے ہیں ۔ ان کا یہ لکھنا کہ صاحبِ منصب اُس شخص کو'' کام کا آدمی'' سمجھتے ہیں جس میں احساسِ انا باقی نہ رہے ۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صدرِ شعبۂ نے یونیورسٹی انتظامیہ کو لکھ دیا ہوگا کہ یہ ہمارے کام کے آدمی نہیں ہیں ۔

مجموعی طور پر اس مضمون میں انفرادی تحقیق اور اجتماعی تحقیق کو موضوع بناتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ہمارے حالات کے مطابق صرف انفرادی تحقیق ہی ذمہ داری سے انجام پا سکتی ہے اور وہی معیاری بھی ہو سکتی ہے ۔ اجتماعی طور پر تحقیق کرنے کے لیے جن اخلاقی ذمہ داریوں کو نبھانے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے ہاں مفقود ہیں اس لیے گروپ ریسرچ کی صورت میں کیے جانے والے کام غیر معیاری ہوتے ہیں ۔بہر حال اگر یہ مضمون اپنی ابتدائی صورت میں یونیورسٹی انتظامیہ کو پیش کی گئی جواب طلبی کے طور پر تحریر ہوا ور اُس میں رشید حسن خاں نے باقاعدہ اربابِ شعبہ کے نام واضح کیے تھے تو اُن کے اور ارباب شعبہ کے درمیان پچھلے کئی برس سے جاری سرد جنگ ، اب یقیناً واضح مخالفت اور تنازعے کا رنگ اختیار کر چکی تھی ۔ اگر یہ مضمون اپنی ابتدائی صورت میں یونیورسٹی انتظامیہ کو اپنی ملازمت کا جواز پیش کرنے کے لیے وضاحتی بیان کے طور پر نہیں بھی پیش کیا گیا تب بھی اس کا متن اظہر من الشّمس ہے اور واقفِ حال اصحاب کے لیے بہت واضح جواب اور جواز بھی ہے کیونکہ اربابِ شعبۂ اُردو کی طرف سے کم از کم زبانی تو ضرور انھیں احساس دلایا جاتا ہوگا کہ ہم نے آپ پر احسان کر کے آپ کو ملازمت دی ہے لہٰذا آپ ہمارے وفادار رہیں اور جو ہم کہیں خاموشی سے کرتے رہیں ۔ ایسے سوالات کا یہ بڑا مناسب جواب تھا اور اس کی ضرورت بھی ہو گئی تھی ۔ یہ مضمون پہلی بار'' نگار پاکستان'' میں مئی ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ زیادہ سے زیادہ جون یا جولائی تک یہ ضرور اہلِ نظر کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔ اس پس منظر میں دیکھیں تو رباب رشیدی کے نام محولا بالا اپنے خط میں رشید حسن خاں نے یہ بھی لکھا ہے کہ :

''۳ ماہ کی طویل مدت ایسی گزری ہے قلم نے ایک سطر نہیں لکھی ۔۔۔۔ ایک عجیب عالمِ تعطل تھا اور پریشان کن حد تک بیزاری طاری تھی''۔ [۱۳]

اس خط پر تاریخ درج نہیں تھی لیکن اس کا تعین پہلے کیا جا چکا ہے کہ یہ اواخر اکتوبر ۱۹۶۹ء کا ہو سکتا ہے ۔ اس طرح رشید حسن خاں کے مندرجہ بالا جملے میں'' ۳ ماہ کی طویل مدت'' کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ رسالہ'' نگارِ پاکستان''

جب جون یا جولائی میں اربابِ شعبہ کو دیکھنے کا موقع ملا ہوگا تو یقیناً اُن کا ردّعمل بھی بہت سخت رہا ہوگا جس کو تین ماہ جھیلنے کے بعد اکتوبر میں رباب رشیدی کو یہ کیفیت اور حالات بتائے جا رہے ہیں۔ صدرِ شعبۂ اُردو کے ایسے ردّعمل کا ذکر رشید حسن خاں نے ایک اور خط میں بھی کیا ہے۔ راج بہادر گوڑ کو رشید حسن خاں نے اپنی کتاب ''ادبی تحقیق : مسائل اور تجزیہ'' بھجوائی تھی۔ اس کے بعد انھیں ۲۶۔ جنوری ۱۹۷۹ء کے خط میں لکھتے ہیں :

> ''اس کتاب میں ایک وہ مضمون بھی شامل ہے جس کے چھپنے کے بعد سابق صدرِ شعبۂ سے کُٹی ہوگئی تھی ۔ اخلاقیاتِ تحقیق کے عنوان سے ذرا اُسے بھی پڑھ ڈالیے''۔ [۱۴]

ظاہر ہے یہ کتاب چھپنے پر اس مضمون کی وجہ سے یہ نہیں لکھ رہے کیونکہ کتاب تو۔۔۔ میں چھپی تھی بلکہ رسالے میں مضمون کے چھپنے کا ذکر کرتے ہوئے ہی کہہ رہے ہیں کہ سابق صدر شعبہ سے کُٹی ہوگئی۔ اور یہ واضح اشارہ خواجہ احمد فاروقی کی طرف ہے کیونکہ خواجہ احمد فاروقی ۱۹۷۳ء میں سابق صدرِ شعبہ ہو چکے تھے۔

رشید حسن خاں کے اس مضمون کی ایک اہمیت اور اب تک ایک طرح سے بنیادی اہمیت تو یہ ہے کہ اُردو کے محققین کو درپیش مسائل کو انھوں نے بڑے واضح انداز سے اس میں بیان کر دیا ہے۔ اس طرح یہ مضمون صرف رشید حسن خاں کی ذاتی روداد ہی نہیں بلکہ مجموعی طور پر بھی اردو والوں کو ایسے مسائل سے اکثر دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس مضمون کی صورت میں رشید حسن خاں کے ضبط کا پیمانہ چھلک جانے سے ایک دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اربابِ شعبہ کی وفاداریاں ، ہمدردیاں اور احسانات کھل کر سامنے آ گئے اور ساتھ ہی ہر ایک کا پول بھی کھل گیا۔ جس کے نتیجے میں رشید حسن خاں کی ملازمت کو تحفظ ملا اور یونیورسٹی انتظامیہ ان کے جواب سے مطمئن ہوگئی ورنہ شعبے سے اُن کی وابستگی ختم کر دیے جانے کا مکمل اہتمام اور انتظام کیا جا چکا ہوگا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کے مطمئن ہو جانے کی دلیل اس سے بھی ملتی ہے کہ صدرِ شعبۂ اُردو کی تمام تر ناراضی اور خفگی کے باوجود ۱۹۷۰ء میں شعبے سے چھپنے والی کتاب ''اشاریۂ کلامِ غالب'' کے مرتبین میں رشید حسن خاں کا نام بھی شامل کیا ہے حالانکہ یہ کام انھوں نے نہیں کیا تھا۔ اس وقت تک شعبے سے دس سال کی وابستگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ اُن کا نام شعبے کی طرف سے شائع ہونے والی کسی کتاب پر دیا گیا ہے۔ صدر شعبہ نے ناگواری سے اور بے دلی سے اُن کا نام شامل کیا اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ایک تو رشید حسن خاں کا پورا نام سرورق پر مرتبین کے ناموں کے ساتھ نہیں لکھا صرف ''رشید حسن'' لکھا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کتاب کے ان تین مرتبین میں سب سے آخر میں اُن کا نام رکھا۔ خواجہ احمد فاروقی نے اپنی بیٹی فرحت فاطمہ اور ایک دوسرے ریسرچ اسسٹنٹ محمد یعقوب کے نام اُن سے پہلے لکھوائے جو یقیناً رشید حسن خاں سے ہر لحاظ سے جونئر تھے۔ یہ بھی کیسا عجیب اتفاق ہے کہ جو تحقیقی کام رشید حسن خاں نے کیے اُن پر اُن کا نام نہیں دیا گیا اور جو کام انھوں نے نہیں کیا اس پر اُن کا نام آ گیا۔

سوال یہ ہے خواجہ احمد فاروقی نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا ایک سبب تو یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ کتاب کی اہمیت کو بڑھانے کے لیے رشید حسن خاں کا نام دیا گیا ہوگا۔ لیکن اس سے زیادہ امکان یہ ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے رشید حسن

خاں کے جواب سے مطمئن ہو کر صدرِ شعبہ کو اس طرح کی کوئی ہدایت کی ہو کہ وہ رشید حسن خاں کی محنت کے اعتراف کے طور پر شعبے کی کتابوں پر اُن کا نام بھی دیا کریں ۔ مہذب معاشروں کا اصول بھی یہی ہوتا ہے ۔ دراصل ریسرچ اسسٹنٹ اُن خوش حال اور ترقی یافتہ ممالک میں ہوتے ہیں جہاں واقعی میں کوئی اسکالر بھی موجود ہوتے ہیں ۔ ایک اسکالر کو اپنے لیے ریسرچ اسسٹنٹ کی یوں ضرورت ہوتی ہے کہ اُس کے لیے وہ مواد کی جمع آوری ممکن بناتا ہے اور اُس مواد کی موضاعاتی تقسیم کرتا ہے اپنی اس معاونت کی وہ تنخواہ پاتا ہے ۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی نہ اس میں استعداد و لیاقت ہوتی ہے نہ اُس پر کوئی پابندی ۔ ہاں البتہ اس جزوقتی ملازمت کے دوران میں وہ اگر اپنی علمی و تعلیمی قابلیت بڑھا لیتا ہے تو اب وہ زیادہ تنخواہ کا بھی مستحق قرار پاتا ہے اور عہد ے میں بھی ریسرچ اسسٹنٹ کی بجائے ریسرچ ایسوی ایٹ یا کو اسکالر(co-scholare) کے طور پر ترقی پاتا ہے ۔ اب اس کی ملازمت کی نوعیت صرف مواد کی فراہمی سے بڑھ کر مطالعے کے بعد نوٹ لینا بھی بن جاتی ہے یا اسکالر کے سامنے اپنے نتائج اور آرا بھی پیش کرسکتا ہے ۔ اس کے بعد اپنی علمیت اور تجربے و مشاہدے کی بنیاد پر اُس کے خود اسکالر بن جانے کے امکانات بھی موجود ہوتے ہیں ۔

ترقی پذیر یا غریب ممالک میں بھی ریسرچ اسسٹنٹ ہوتے ہیں لیکن کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی اسکالر کا ریسرچ اسسٹنٹ ہونا اور بننا انھیں نصیب ہو سکے ۔ اکثر اوقات یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی بیوروکریٹ یا کسی ادارے اور شعبے کے سربراہ کے ریسرچ اسسٹنٹ ہوتے ہیں ۔ دوسری بات یہ کہ ایسے لوگ دراصل اسسٹنٹ کی بجائے خود اسکالر ہوتے ہیں لیکن اپنے اپنے ملکی حالات کے تحت بے روزگاری کی وجہ سے اس متوسط طبقے کے اسکالر کو مجبوراً دوسروں کا اسسٹنٹ بننا گوارا کرنا پڑتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے نام نہاد اسکالرز کے لیے سارا تحقیقی کام مواد کی فراہمی سے لے کر اُس کی ترتیب و تدوین اور استخراجِ نتائج تک اُن کے ریسرچ اسسٹنٹ نے کرنا ہوتا ہے اور تحقیقی کارنامے چھپتے ہیں اُس کے نام نہاد اسکالر افسر کے نام سے ۔ وہ بڑی مہربانی کرے تو دیباچے میں اُس کا شکریہ ادا کر دیتا ہے ۔ اس طرح اس کے معاونینِ تحقیق اپنے مزاج اور حالات کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جن کا دائرہ علم محدود اور بنیادی مقصد صرف تنخواہ کا حصول ہوتا ہے دوسرا طبقہ بھی مجبور اور تنخواہ کا متمنی تو ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دفتری اوقات کے علاوہ اپنے طور پر بھی بعض تحقیقی منصوبوں پر کام کر رہا ہوتا ہے یا کسی کا معاون بننے سے پہلے بھی بطور اسکالر جانا جا رہا ہوتا ہے ۔ اس دوسری صورت میں تنازعات شروع ہوتے ہیں پاک و ہند میں زبان و ادب کے شعبوں میں خاص طور پر ایسے تنازعات سامنے آتے رہتے ہیں ۔ ایسا ریسرچ اسسٹنٹ یہ سمجھتا ہے کہ میرا کام صرف یہ ہے کہ مواد جمع کروں اور اُس کی موضوعاتی تقسیم کروں جبکہ جس کی معاونت پر وہ مامور ہوتا ہے اُس کی خواہش اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ چونکہ میں نے اسے ملازمت پر رکھا ہے سو سارا تحقیقی اور تصنیفی کام بھی یہی کرے ۔

اس سارے عمل میں منافقانہ رویہ کچھ اور بھی گل کھلاتا ہے ۔ مثلاً وہ نام نہاد اسکالر اور افسر جس پڑھے لکھے اور صاحبِ تصنیف شخص کو اپنا ریسرچ اسسٹنٹ مقرر کرتا ہے تو اُس کی تقرری کے وقت بات صاف نہیں کی جاتی ۔ اُس سے

علم دوستی اور علمی تعاون کے انداز میں بڑی عزت و توقیر کے ساتھ یہ کہہ کر مقرر کیا جا رہا ہوتا ہے کہ آپ کے آنے سے ہماری کچھ مدد اور رہنمائی ہوتی رہے گی اور جو کام بھی ہم مل کر، کر پائے وہ شعبے اور ادارے کا علمی و تصنیفی سرمایہ ہوگا۔ اس جھانسے میں کام مکمل کروا لیا۔ جب اُس کی اشاعت کی نوبت آئی تب معاونِ تحقیق کو اُس کی ''اوقات'' بتائی گئی اور بطور اسکالر یا معاون اسکالر اُس کا نام شامل نہ کیا گیا۔ اس سے نام نہاد اسکالر کے پیشِ نظر دو فائدے ہوتے ہیں ایک یہ کہ اگر تحقیقی کاوش کو سراہا جائے گا تو لازمی بات ہے تمام تعریف و تحسین وہ خود سمیٹے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر کسی نے اُس میں کچھ خرابیوں کی نشاندہی کر دی تو وہ آسانی سے ریسرچ اسسٹنٹ پر ڈالی جا سکتی ہیں۔ یہی سب کچھ رشید حسن خاں کے ساتھ ہوا۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بطور ریسرچ اسسٹنٹ وابستہ ہوئے۔ اس سے پہلے ادبی رسائل میں اُن کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہو کر اُن کی علمیت کو متعارف کروا چکے تھے۔ وہ عالم ہونے اور علمی شہرت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ شریف النفس، صاف گو، سادہ اور خوددار بھی تھے۔ وہ ایسی سیاسی مصلحتوں اور منافقتوں کے قائل ہی نہیں تھے کہ کام وہ کریں اور اس کا کریڈٹ کوئی دوسرا لے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں رہتے ہوئے اُن پر ایسی آزمائشیں بار ہا آئیں اور ثابت قدم رہنے پر نقصانات بھی اٹھائے۔ کسی نے احساس کم تری کا طعنہ دیا تو کسی نے خود پسند ہونے کا الزام لگایا جبکہ وہ صرف اس اصول کی پابندی کر رہے تھے کہ ایک مہذب معاشرے میں یا کم از کم پڑھے لکھے مہذب لوگوں میں تو یہ ہونا چاہیے کہ جس کام اور عہدے کی تنخواہ دی جاتی ہے اس کے علاوہ اگر اُن سے تحقیقی، تدوینی اور تصنیفی کام بھی لیا جاتا ہے تو وہ اُن کے نام سے چھپنا تو چاہیے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ رشید حسن خاں، رشید حسن خاں کے خطوط، مرتبہ؛ ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو، ۲۰۱۲ء، ص: ۸۸۵

۲۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔، ص: ۴۳۲۔۴۳۳

۳۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔، ص: ۶۳۱

۴۔ رشید حسن خاں، ''ادبی تحقیق سے متعلق بعض مسائل''، مشمولہ؛ نگار پاکستان، کراچی: مئی ۱۹۶۸ء، ص: ۲۶۔۲۷

۵۔ رشید حسن خاں، ''ادبی تحقیق سے متعلق بعض مسائل''، مشمولہ؛ نگار پاکستان، کراچی: مئی ۱۹۶۹ء، ص: ۲۷

۶۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔، ص: ۲۸

۷۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔، ص: ۳۰۔۳۱

۸۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، بیسویں صدی کی ممتاز شخصیت پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، نئی دہلی: انجمن ترقی اُردو ہند، ۲۰۰۰ء، ص: ۳۹

۹۔ رشید حسن خاں ،'' ادبی تحقیق سے متعلق بعض مسائل''، مشمولہ؛ نگار پاکستان ، مئی ۱۹۶۹ء، ص: ۲۹

۱۰۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔، ص: ۳۲

۱۱۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔، ص: ۳۳

۱۲۔ رشید حسن خاں ، ادبی تحقیق : مسائل اور تجزیہ، لکھنؤ: اتر پردیش اُردو اکادمی۔۱۹۹۹۰ء، ص: ۵۴۔ ۵۶

۱۳۔ رشید حسن خاں ، رشید حسن خاں کے خطوط، مرتبہ؛ ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، ص: ۶۳۲

۱۴۔ ایضاً۔۔۔ایضاً۔۔۔، ص: ۴۰۵